دلیلِ مدرّسین

شعبہ تعلیم وتربیت

شائع کردہ

تنظیمِ اسلامی

دارالاسلام مرکز تنظیم اسلامی، ملتان روڈ چوہنگ، لاہور 53800

فون: 78-35473375(042)

ای میل:markaz@tanzeem.org ویب سائٹ: www.tanzeem.org

پیش لفظ

قرآن مجید روئے زمین پر انسانیت کے لیے اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہدایت نامہ ہے، اس ہدایت نامہ پر عمل کیے بغیر نہ تو دنیا میں کامیابی مل سکتی ہے اور نہ ہی آخرت میں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ یہ وہ واحد کتاب ہے جو آج بھی محفوظ ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک محفوظ رہے گی۔ نبی کریم ﷺ کا اساسی منہجِ انقلاب بھی قرآن مجید ہی سے ماخوذ ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی ﴿كَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيۡكُمۡ وَيُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ﴾ (البقرة: 151) ''جیسا کہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے، جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے'' آنحضور ﷺ نے دعوت وتبلیغ اور تزکیہ وتربیت کا کام کیا تو قرآن کے ذریعہ، حکمت کی تعلیم دی تو قرآن کے ذریعہ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بنیانِ مرصوص بنایا تو قرآن کے ذریعہ۔ اب بھی اگر کوئی انہی کاموں کا عزم لے کر اٹھے تو اس کے لیے بھی قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کیے بغیر چارہ نہیں۔ آج بھی باطل نظریات وعقائد کے قلع قمع کے لیے مؤثر ترین ہتھیار قرآن مجید ہے۔ لیکن بدقسمتی سے کچھ لوگ اور تحاریک قرآن کے نام پر اٹھیں اور گمراہی کے راستہ کو اپنا لیا۔

اندریں حالات مدرسینِ قرآن کے لیے ان احتیاطی تدابیر کو اختیار کرنا ضروری ہیں جو دعوت وتبلیغ اور اقامتِ دین کے پیغمبرانہ مشن پر چلنے والوں کے لیے ضروری ہیں۔ اس مشن کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اللہ کی نازل کردہ اس کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کا خود بھی گہرا علم حاصل کریں اور اس مشن کی انجام دہی کے ہر مرحلہ اور ہر موڑ پر بھی اس کا استعمال کریں۔ نبی اکرم ﷺ کے فرمان '' خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ '' کے مطابق تعلیم وتعلّمِ قرآن سے بڑھ کر کوئی کیریئر نہیں، لیکن ''جن کے رُتبے ہیں سِوا، اُن کی سِوا مشکل ہے'' کے مصداق اس خدمتِ قرآنی کے لیے قرآنِ حکیم کے ترجمہ اور تفسیر کے ان مقررہ اصولوں اور آداب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے جو ہمارے اسلاف نے بیان کیے ہیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر شعبہ تعلیم وتربیت نے تنظیمِ اسلامی کے مدرّسین کے لیے خصوصی ہدایات مرتب کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس خدمتِ قرآنی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین یارب العالمین

مرکزی ناظمِ تعلیم وتربیت

تنظیم اسلامی پاکستان

مدرّسینِ قرآن کے لیے خصوصی ہدایات

قرآن وحدیث کی روشنی میں

گزشتہ چار پانچ دہائیوں سے فہمِ قرآن کی جو تحریک پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں بالعموم اور شہر لاہور میں بالخصوص جس تیزی سے پھیل رہی ہے وہ واقعتاً ایک بہت ہی مستحسن امر ہے، اور یہ کہنے میں بھی کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اس تحریک نے ایک بہت بڑے تعلیم یافتہ طبقے کو متاثر کیا ہے اور ہزاروں افراد کی زندگیوں کے رُخ کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ یہ درسِ قرآن اور ترجمہ قرآن کی کلاسز کے ہی ثمرات ہیں کہ آج ہر طرف فہمِ قرآن کے ادارے نظر آتے ہیں اور قرآن کے درس و تدریس کا رجحان بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ہم فہمِ قرآن کی اس تحریک کے حق میں ہیں اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس تحریک کے اکثر افراد نے اعلیٰ سطح کی دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ انجمن خدام القرآن کے زیرِ اہتمام قرآن اکیڈمیوں سے ایک یا دو سال پر مبنی رجوع الی القرآن کورسز بھی کیے ہوئے ہیں جبکہ بہت سے افراد نے اس کے ساتھ ساتھ روایتی و دینی مدارس سے باقاعدہ درسِ نظامی اور دراساتِ دینیہ کے کورسز بھی کیے ہیں اس لیے اکثر و بیشتر مدرسین بہت اچھے انداز میں قرآن پاک کی تعلیمات عوام الناس تک پہنچاتے ہیں لیکن ان میں کچھ ایسے مدرسین بھی ہیں جنھوں نے ٹھوس علمی بنیادوں پر رجوع الی القرآن کورسز یا دینی مدارس سے استفادہ نہیں کیا ہوتا۔ اس لیے اپنی کم علمی کی وجہ سے یہ حضرات بعض اوقات لاشعوری طور پر درسِ قرآن کے اصل مقصد سے ہٹ کر ایک ایسی راہ پر چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ جس سے عوام الناس تک ہمارا پیغام صحیح انداز سے نہیں پہنچ پاتا اور خلط مبحث کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ایسے مدرسین، اپنے خلوص کے باوجود معاشرے کی اصلاح کی بجائے اس میں عدم توازن کا سبب بن سکتے ہیں۔ اس مضمون میں ہمارے پیشِ نظر قرآن وحدیث کی روشنی میں مدرسین کی اُن کوتاہیوں کی نشاندہی کرنا ہے جو عام طور

پر معاشرے میں اصلاح کی بجائے خرابی کا باعث بنتی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ مضمون تعلیم وتعلمِ قرآن سے منسلک حضرات کو ایک منہج(۱) بھی فراہم کرتا ہے جس پر چل کر وہ اپنے دروس کو عوام الناس کے لیے زیادہ مفید بنا سکتے ہیں۔

اس مضمون سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم دروسِ قرآن کے عوامی حلقوں کے خلاف ہیں، بلکہ ان گزارشات سے ہمارا مقصود مدرسین کو صرف یہ حقیقت باور کرانا(۲) ہے کہ ان کی اصل حیثیت مصلح اور داعی کی ہے نہ کہ مفتی کی، اور حلقہ ہائے دروسِ قرآنی کا اصل ہدف انذار وتبشیر اور تذکیر ہے نہ کہ تفسیر وتاویل۔

اس ضمن میں قرآن وحدیث پر مبنی چند ہدایات درج ذیل ہیں:

۱) اخلاص

دینِ اسلام میں ''نیت'' کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ))(1)☆

"بیشک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔"

اللہ کے رسول ﷺ کی اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اعمال کی جزا و سزا کا دارومدار نیت کی درستگی یا نادرستگی پر ہے۔ بظاہر ایک عمل لوگوں کے ہاں بہت بڑی نیکی کا کام ہوتا ہے لیکن اللہ کے ہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، بلکہ بعض اوقات یہ عامل کے لیے عذاب کا باعث بھی بن جاتا ہے، کیونکہ اس میں اخلاص نہیں ہوتا۔ مدرّسین کو چاہیے کہ سب سے پہلے اپنے اندر اخلاص پیدا کریں، خالصتاً اللہ کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لیے درسِ قرآن دیں۔ بعض اچھے مدرسین کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ وہ اپنے دروس میں لوگوں کی تعداد کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں، اگر کسی جگہ لوگوں کی تعداد کم ہو تو وہاں درس دینے سے یا تو انکار کر دیتے ہیں یا اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا اخلاص کے منافی ہے۔

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ ایک جگہ ایک بڑے مجمع سے خطاب کے لیے تشریف لے گئے، تقریباً دو گھنٹے توحید پر درس دیا۔ جب آپ کا درس ختم ہو چکا تو تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا شخص وہاں پہنچا۔ حضرت شاہ صاحب نے جب اس بوڑھے سے وہاں آنے کا مقصد پوچھا تو اس نے حضرت شاہ صاحب

(۱) طریق (۲) یقین دلانا ☆ انگریزی نمبر کے حواشی مضمون کے آخر میں صفحہ نمبر 33 پر درج ہیں

کو بتایا کہ وہ ان کا درس سننے کے لیے آیا تھا۔ حضرت شاہ صاحب اس بوڑھے شخص کے جذبے اور ولولے کو دیکھ کر مکمل درس اس اکیلے بوڑھے کو دوبارہ سنانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس پر وہ بوڑھا حضرت شاہ صاحب سے پوچھنے لگا کیا آپ مجھ اکیلے کے لیے دوبارہ اتنا طویل درس دیں گے؟ تو شاہ صاحب نے اس کو جو جواب دیا وہ واقعتاً سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ انہوں نے فرمایا:

"پہلے بھی ایک (اللہ تعالیٰ) ہی کو راضی کرنے کے لیے درس دیا تھا اور اب بھی ایک ہی کو راضی کرنا مقصود ہے"۔

جب انسان کے سامنے اصل مقصود اللہ کی رضا ہو تو پھر اس بات کی اہمیت بہت کم رہ جاتی ہے کہ آپ کا درس سننے کے لیے کتنے افراد تشریف لاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کامیاب مدرّس اس کو شمار کیا جاتا ہے جس کے درس میں لوگوں کی تعداد زیادہ ہو، جبکہ اللہ کے ہاں کامیاب مدرس وہ ہے جس میں اخلاص زیادہ ہو، چاہے اس کے درس میں شریک ہونے والوں کی تعداد بہت کم ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے مدرّسین کو چاہیے کہ وہ شیطان کے وسوسے میں آ کر حاضرین کی تعداد کو اپنے درس کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار نہ بنائیں، بلکہ اپنا اصل مقصود اللہ کی رضا کو بنائیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے کہ وہ آپ کے اخلاص کی بنیاد پر دیے گئے درس میں شریک فردِ واحد سے ہی دین کی کوئی اتنی بڑی خدمت لے لے جو کہ عدمِ اخلاص کی بنیاد پر دیے گئے درس میں شریک ہزاروں سامعین کے مجموعی عمل سے کئی گنا زیادہ ہو۔

۲) اِنذار اور فتویٰ کا فرق

بعض مدرّسین کے حوالے سے یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ وہ اپنے دروس میں قرآنی آیات کو جب مختلف افراد، اسلامی جماعتوں اور مسلمان معاشروں پر چسپاں کرتے ہیں تو اُن کا اسلوب ناصحانہ کی بجائے مفتیانہ ہوتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض مدرّسین نفاق، شرک اور کفر سے متعلقہ آیات کا درس دیتے ہوئے بڑی دیدہ دلیری سے عام مسلمانوں پر ان آیات کا انطباق کرنا شروع کر دیتے ہیں اور نتیجتاً مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت کو منافق، کافر، مشرک اور جہنمی بنا دیتے ہیں۔ مثلاً ایک مدرّس اپنے درس کے لیے نفاق سے متعلقہ آیات کا انتخاب کرتا ہے، پھر اُن آیات کا عام مسلمانوں پر انطباق کرتا ہے، اور آخر میں آیت مبارکہ ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ

الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ج﴾ (النساء:145) سنا کر اپنے تئیں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو جہنمی اور اس آیت مبارکہ کا مصداق بنا دیتا ہے۔ یہ طرزِ عمل قرآن کے اس مقصد کے بھی خلاف ہے جس کی خاطر اس کو نازل کیا گیا ہے۔ قرآن اس لیے نہیں آیا کہ ہم لوگوں پر فتوے لگا کر خوش ہوں کہ تم جہنمی ہو، منافق ہو، مشرک ہو، کافر ہو وغیرہ، بلکہ قرآن تو اس لیے آیا ہے کہ ہم لوگوں کو نفاق، شرک اور کفر سے نکال کر جنتی بنائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تبشیر (جنت کی بشارت) کے ساتھ ساتھ انذار (آخرت کا خوف دلانا) بھی مطلوب ہے، لیکن انذار اور فتویٰ میں بہت فرق ہے۔ انذار یہ ہے کہ آپ لوگوں کو خبردار کریں' انہیں بتائیں کہ یہ منافقین کی صفات ہیں، یہ اعمال مشرکانہ یا کافرانہ ہیں، قرآن نے ان چیزوں سے روکا ہے اور ان کے مرتکبین کو جہنم کی وعید سنائی ہے۔ یہ تو انذار کا انداز ہے۔ جب کہ فتویٰ کا اسلوب یہ ہے کہ آپ کہیں جو یہ کام کرے گا وہ کافر ہے، مشرک ہے، جہنمی ہے، ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ قرآنی آیات کا مخصوص مسلمانوں اور مسلمان معاشروں پر انطباق کرنا شرعی اصطلاحات کے مطابق اجتہاد ہی کی ایک قسم ہے اور یہ کام فقہاء اور مفتیانِ کرام کا ہے، مدرسین کا نہیں۔ عربی زبان کے چند بنیادی قواعد کو سیکھ لینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آدمی درجۂ اجتہاد اور مسندِ افتاء پر فائز ہو گیا ہے اور اس کے پاس یہ سند آ گئی ہے کہ لوگوں پر قرآنی نصوص کا انطباق کرتا پھرے، بلکہ مدرّسین کو چاہیے کہ اپنے دروس میں عوام الناس کو منافق اور جہنمی قرار دینے کی بجائے انہیں ایک باعمل مؤمن اور جنتی بنانے کی طرف توجہ دیں۔ جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا ہے کہ چودہ صدیوں میں ہم نے اتنے مسلمان نہیں بنائے ہیں جتنے اس ایک صدی میں کافر بنا دیے ہیں۔

۳) تفسیر بالماثور کا التزام

تفسیر کی دو قسمیں ہیں: تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے۔ تفسیر کی پہلی قسم "تفسیر بالماثور" کے جواز (۱) کے بارے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، جبکہ دوسری قسم "تفسیر بالرائے" کے جائز ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال اور تفاصیل ہیں۔

تفسیر بالماثور کو "تفسیر بالروایہ" یا "تفسیر بالمنقول" بھی کہتے ہیں۔ اس کی مزید چار قسمیں ہیں:

(i) قرآن مجید کی تفسیر قرآن مجید سے کرنا۔

---

(۱) جائز ہونا

(ii) قرآن مجید کی تفسیر حدیث سے کرنا۔

(iii) قرآن مجید کی تفسیر اقوالِ صحابہؓ سے کرنا۔

(iv) قرآن مجید کی تفسیر اقوالِ تابعینؒ سے کرنا۔

اللہ کے رسول ﷺ جس طرح صحابہ کرام کو قرآن مجید کے الفاظ کی تعلیم دیتے تھے اسی طرح قرآن مجید کے معانی بھی سکھاتے تھے کیونکہ یہ آپ کا فریضہ تھا جو منجانب اللہ آپ کے ذمہ عائد کیا گیا تھا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل 44)

اور ہم نے اے نبیؐ! آپ کی طرف الذکر نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے لیے ان کی طرف نازل کردہ چیز (قرآن مجید) کے معنی واضح کریں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھایا اور صحابہ کرامؓ کو قرآنی الفاظ کے معانی کی بھی تعلیم دی۔ مشہور تابعی ابوعبدالرحمان السلمی کا قول ہے:

”حَدَّثَنَا الَّذِيْنَ كَانُوْا يَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ كَعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ وَعَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ وَغَيْرِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوْا اِذَا تَعَلَّمُوْا مِنَ النَّبِيِّ ﷺ عَشْرَ اٰيَاتٍ لَمْ يَتَجَاوَزُوْهَا حَتّٰى يَعْلَمُوْا مَا فِيْهَا مِنَ الْعِلْمِ وَالْعَمَلِ“

(الاتقان: ۲/۱۷۶ نوع نمبر ۷۸)[2]

صحابہ کرامؓ میں سے جو حضرات ہمیں قرآن مجید کی تعلیم دیا کرتے تھے مثلاً حضرت عثمانؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ، اُنہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ جب آپؐ سے دس آیتیں سیکھتے تو ان سے اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک کہ ان آیات کی تمام علمی وعملی باتوں کا علم نہ حاصل کرلیں۔

اس قسم کے اور بھی بہت سارے آثار مروی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن کی تفسیر خود بیان کی ہے۔ ہمارے ہاں مدرّسین میں حدیث کا فہم اور مطالعہ نہ ہونے کی وجہ سے عموماً یہ کوتاہی پائی جاتی ہے کہ وہ بعض اوقات آیاتِ قرآنیہ کی ایسی تفسیر کر جاتے ہیں جو احادیث رسول ﷺ کے صریحاً خلاف ہوتی ہے۔ عموماً دیکھنے میں آتا ہے کہ عربی زبان کی واجبی سی

شُدبُد [۱] حاصل کرنے کے بعد مدرّسین یہ سمجھتے ہیں کہ وہ امام ابن کثیر، علامہ قرطبی اور ابن جریر طبری رحمہم اللہ اجمعین جیسے جلیل القدر مفسرین کی صف میں، بلکہ شاید اُن سے بھی کچھ آگے کھڑے ہیں۔ یہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ علمِ حدیث سے ناواقفیت کی وجہ سے اللہ کے رسول ﷺ کی تفسیر سے ہٹ کر تفسیر بالرائے کرتے ہیں اور اس پر مصر [۲] بھی ہوتے ہیں۔ جان لیجیے کہ یہ اہل سنت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ جو تفسیر بھی حدیث کے خلاف ہوگی وہ مردود اور قابل مذمت ہے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی فرماتے ہیں:

”تفسیر میں اصل گمراہی کا سبب اس بنیادی حقیقت کو بھول جانا ہے کہ قرآن کے مطالب وہی ہیں جو اس کے مخاطبِ اوّل (یعنی محمد ﷺ) نے سمجھے اور سمجھائے ہیں۔ قرآن محمد ﷺ پر نازل ہوا اور قرآن بس وہی ہے جو محمد ﷺ نے سمجھا اور سمجھایا ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے' یا تو علمی، روحانی نکتے ہیں، جو قلبِ مؤمن پر القاء ہوں اور یا پھر اقوال وآراء ہیں، اٹکل پچو باتیں ہیں، جن کے محتمل قرآنی لفظ کبھی ہوتے ہیں اور کبھی نہیں ہوتے' لیکن یہ یقینی بات ہے کہ وہ باتیں قرآن سے مقصود نہیں ہیں۔ قرآنی مقصود صرف وہی ہے جو رسول ﷺ نے سمجھا اور سمجھایا ہے۔ دوسری کسی بات کو مقصودِ قرآنی کہنا ظلم وزیادتی ہے اور افتراء علی اللہ“۔ [۳](3)

لہٰذا مدرّسین کو چاہیے کہ درسِ قرآن دیتے ہوئے حدیث اور اقوالِ صحابہؓ کا خصوصی اہتمام کریں۔ اصل تفسیر ”تفسیر بالماثور“ ہی ہے۔ تفسیر کی اس قسم میں احتیاط ملحوظ رکھنا اس قدر ضروری ہے کہ تفسیر سے متعلقہ احادیث، اقوالِ صحابہ اور اقوال تابعین کو بیان کرتے وقت صحیح سند سے ثابت شدہ احادیث اور اقوال کا التزام [۴] کیا جائے۔ تفسیر بالماثور پر مشتمل معروف تفاسیر میں تفسیر طبری، تفسیر ابن کثیر اور مولانا عبدالرحمن کیلانی صاحب کی تیسیر القرآن کا مطالعہ مدرّسین کو لازماً کرنا چاہیے، کیونکہ یہ تفاسیر ایک مدرّس بلکہ مفسّر کے لیے بھی ایک حد قائم کردیتی ہیں کہ یہ وہ حدود ہیں جن سے قرآن کے درس اور تفسیر میں تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔

---

(۱) تھوڑی سی مہارت (۲) اصرار کرنے والا (۳) اللہ پر جھوٹ باندھنا/خودساختہ بات اللہ سے منسوب کرنا (۴) لازم کرنا

۴) تفسیر بالرائے سے اجتناب

اس کو"تفسیر الدرایہ"اور"تفسیر بالمعقول" بھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد قرآن کی تفسیر خود قرآن، یا حدیث، یا اقوالِ صحابہ یا اقوالِ تابعین سے کرنے کی بجائے اپنے اجتہاد اور رائے کی بنیاد پر کرنا ہے۔تفسیر بالرائے کی دو قسمیں ہیں:تفسیر بالرائے المحمود اور تفسیر بالرائے المذموم۔

تفسیر بالرائے المحمود: درج ذیل اوصافِ ثلاثہ پر مشتمل تفسیر، تفسیر بالرائے المحمود کہلاتی ہے:

i) جو تفسیر سلف صالحین(۱) کے عقیدے، منہجِ تفسیر اور اصولِ تفسیر کے مطابق ہو۔

ii) تفسیر بالماثور کے مخالف نہ ہو اور قواعد لغویہ عربیہ کے موافق ہو۔

iii) جس کے مفسر میں تفسیر کی تمام علمی، اخلاقی، دینی، عقلی اور عملی شرائط پائی جاتی ہوں۔

تفسیر بالرائے المذموم: اگر کسی تفسیر میں درج ذیل اوصاف میں سے کوئی ایک وصف بھی پایا جائے تو وہ تفسیر بالرائے المذموم ہے:

i) جو سلف صالحین کے عقیدے، منہجِ تفسیر یا اصولِ تفسیر کے خلاف ہو۔

ii) تفسیر بالماثور یا قواعدِ لغویہ عربیہ کے خلاف ہو۔

iii) جس کا مفسر جاہل ہو یا ان تفسیری علوم سے ناواقف ہو کہ جن کا علم ایک مفسر کے لیے از بس ضروری ہے، مثلاً علمِ حدیث، علمِ لغت، علمِ نحو، علمِ صرف، علمِ اشتقاق، علمِ بلاغت، علمِ اصولِ فقہ، علمِ قراءت، علمِ ناسخ ومنسوخ، علمِ اسبابِ نزول، علمِ اصول الدین (یعنی عقائد)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ تفسیر بالرائے جائز ہے، لیکن اس کے باوجود صحابہ کرام ؓ اور تابعین عظامؒ اپنے تقویٰ وورع(۲) کی بنیاد پر تفسیر بالرائے سے حتی الامکان گریز کرتے تھے اور ممکن حد تک تفسیر بالماثور پر ہی اکتفا(۳) کرتے تھے، جیسا کہ درج ذیل آثار سے واضح ہوتا ہے۔

امام ابن جریر طبریؒ لکھتے ہیں:

i) حضرت ابو معمر الازدیؒ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے قرآن کی آیت ﴿وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا﴾ (سورۃ عبس:31) کے بارے میں سوال ہوا تو جواب میں آپ ؓ کہنے لگے:

(۱) گزرے ہوئے نیک لوگ (۲) پرہیز گاری (۳) کافی سمجھنا

أَيُّ أَرْضٍ تُقِلُّنِي وَأَيُّ سَمَاءٍ تُظِلُّنِي إِذَا قُلْتُ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِي(4)

"کون سی زمین مجھے اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اگر میں قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کروں؟"

ii) حضرت ابن ابی ملیکہؒ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ سُئِلَ عَنْ آيَةٍ لَوْ سُئِلَ عَنْهَا بَعْضُكُمْ لَقَالَ فِيهَا، فَأَبَى أَنْ يَّقُوْلَ فِيهَا(5)

"حضرت ابن عباس ؓ سے قرآن کی ایک آیت (کی تفسیر) کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے اس آیت کی تفسیر سے اجتناب(۱) کیا۔ اگر تم میں سے کسی سے اس آیت کے مفہوم کے بارے میں سوال کیا جاتا تو وہ ضرور اس کا مفہوم بتا دیتا"۔

iii) حضرت طلق بن حبیبؒ سے روایت ہے کہ وہ حضرت جندب ؓ کے پاس آئے اور ان سے قرآن کی ایک آیت کی تفسیر پوچھی، حضرت جندب ؓ نے جواب دیا:

''میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ اگر تم مسلمان ہو تو میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔ یا یہ کہا کہ میرے پاس مت بیٹھو''۔

iv) حضرت یزید بن ابی یزیدؒ سے روایت ہے کہ:

كُنَّا نَسْأَلُ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيِّبِ عَنِ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ، وَكَانَ أَعْلَمَ النَّاسِ، فَإِذَا سَأَلْنَاهُ عَنْ تَفْسِيرِ آيَةٍ مِنَ الْقُرْآنِ سَكَتَ كَأَنْ لَّمْ يَسْمَعْ(6)

"ہم حضرت سعید بن مسیبؒ سے حلال وحرام کے بارے میں سوال کرتے تھے، کیونکہ انہیں اس چیز کا سب سے زیادہ علم تھا، لیکن جب ہم ان سے قرآن کی کسی آیت کی تفسیر پوچھتے تو وہ ایسے خاموش ہو جاتے تھے جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو"۔

v) علامہ ابن سیرینؒ سے روایت ہے کہ میں نے عبیدہ السلمانیؒ سے قرآن کی ایک آیت کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے کہا:

(۱) پرہیز/کنارہ کشی

ذَهَبَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْقُرْاٰنَ فِيْمَ اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ، اِتَّقِ اللّٰهَ وَ عَلَيْكَ بِالسَّدَادِ[7]

"وہ لوگ چلے گئے جو قرآن کا علم جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ قرآن کس بارے میں نازل ہوا۔ اللہ سے ڈرو اور سیدھی راہ پر چلتے رہو"۔

vi) علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ کہتے تھے:

"ہمارے اساتذہ تفسیر کرنے سے بچتے اور ڈرتے تھے"۔[8]

vii) مسروقؒ کہا کرتے تھے:

"تفسیر کرنے سے بچو اور ڈرو، کیونکہ تفسیر اللہ کی طرف سے روایت (۱) ہے"۔[9]

مذکورہ بالا آثار سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ پر قرآن کی کسی آیت کی تفسیر کرتے وقت کس قدر اللہ کا خوف اور ڈر غالب ہوتا تھا باوجودیکہ وہ اس کے سب سے زیادہ اہل بھی تھے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ:

i) تفسیر بالرائے سے حتی الامکان گریز کرنا چاہیے۔

ii) اگر تفسیر بالرائے کرنی ہی ہو تو ایسا شخص کرے جو صحیح معنوں میں اس کا اہل ہو اور ان شرائط کے مطابق کرے جو کہ تفسیر بالرائے المحمود کے ضمن میں اوپر بیان ہو چکی ہیں۔

iii) علاوہ ازیں یہ کہ تفسیر بالرائے کرنے کے بعد بھی اس کو اپنی رائے ہی کے طور پر بیان کرے اور اللہ کی طرف اس کی نسبت کرنے سے ڈرتا رہے۔

iv) ہمارے ہاں مدرّسین چونکہ تفسیر بالرائے کی مذکورہ بالا شرائط پر پورے نہیں اُترتے لہٰذا ان کے لیے درسِ قرآن دیتے وقت قرآنی آیات کا مسلم معاشروں پر انطباق (۲) کرنا یا ان سے نئی نئی تفاسیر اختراع (۳) کرنا بالکل بھی جائز نہیں ہے۔ مدرسین کو چاہیے کہ اپنے دروس میں اوّل تو تفسیر بالماثور پر ہی اکتفا کریں، لیکن اگر تفسیر بالرائے کے ضمن میں کچھ بیان کرنا بھی پڑے توصرف معروف معاصر مفسرین کے حوالے سے ہی کچھ بیان کر دیں اور اپنی الگ رائے ہرگز پیش نہ کریں!

(۱) بیان (۲) چسپاں کرنا (۳) نئی چیز پیدا کرنا

یہ بھی واضح رہے کہ تفسیر اور تذکیر میں فرق ہے۔ نصیحت اور یاددہانی تو ایک مسلمان کے لیے ان قرآنی آیات میں بھی ہے جو پچھلی اقوام کے بارے میں نازل ہوئی ہیں لہٰذا قرآن کی ہر ہر آیت ہمارے لیے تذکیر کا باعث ہے اور اس کو بطور نصیحت بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن آیات کی تفسیر ایک بالکل علیحدہ شے ہے۔

مثلاً قرآن کی آیت ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ج﴾ (النساء:145) میں تذکیری پہلو تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو اعتقادی نفاق کے بارے میں ڈرتے رہنا چاہیے کہ وہ ہمارے اندر پیدا نہ ہو جائے، اگر پیدا ہو جائے تو اس کی اس بدترین سزا کے پیش نظر اس کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ ہم اس آیت کو معاشرے کے بعض افراد یا طبقوں پر apply (۱) کرنا شروع کر دیں یعنی ان الفاظ قرآنی کے مصداق (۲) مت تلاش کریں۔

۵) قرآن کتاب ہدایت ہے

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن میں ہمیں مختلف علوم کا تذکرہ ملتا ہے، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ قرآن نہ تو سائنس کی کتاب ہے اور نہ ہی فلسفے کی، بلکہ یہ کتابِ ہدایت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو اور ان کی آئندہ آنے والی ذرّیت کو جنت سے اتار کر اِس دنیا میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تو اللہ کی طرف سے یہ فرمان جاری ہوا:

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ج فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۳۸﴾ (البقرۃ:38)

"ہم نے کہا تم سب یہاں سے اتر جاؤ، پس جب تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو بھی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا تو انہیں نہ تو کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے"۔

اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۲﴾ (البقرۃ:2)

"یہ کتاب، اس میں کوئی شک نہیں ہے، یہ ہدایت ہے متقین کے لیے"۔

(۱) چسپاں کرنا (۲) جس پر معنی صادق آتے ہوں

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى﴾ (البقرۃ:185)

"یہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا، یہ پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت ہے اور ہدایت کے واضح دلائل پر مشتمل ہے"۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"پرانے وقتوں میں یونانی فلسفے، ایرانی اوہام اور ہندی تصوف کے جال پھیلے ہوئے تھے۔ موجودہ زمانے میں یورپ کی ذہنی غلامی نے عقلوں پر قبضہ کر رکھا ہے اور یورپ کی خرافات (۱) کو بھی حقائق سمجھ لیا گیا ہے۔ کتاب اللہ کو توڑ مروڑ کر یورپین نظریوں پر منطبق (۲) کرنے کا ایک جنون پھیلا ہوا ہے۔ کوئی ڈارون کی تھیوری قرآن سے ثابت کرتا ہے اور کوئی آئن سٹائن کے نظریے کو قرآن پر چسپاں کرتا ہے۔ حالانکہ کتاب اللہ کا مقام اس سے کہیں ارفع واعلیٰ ہے کہ اسے انسانی تخیلات کا تابع (۳) بنایا جائے۔ کتاب اللہ نہ عقلیات کی کتاب ہے اور نہ سائنس میں دخل دیتی ہے، وہ تو انسانی ہدایت کے لیے آئی ہے' اور اس سے کھیلنا نہیں بلکہ ہدایت حاصل کرنا چاہیے تھا۔ قرآن عقلِ سلیم کے عین مطابق ہے، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ علمائے یورپ کے جملہ نظریات واوہام کی کسوٹی (۴) پر بھی پورا اترے!"(10)

اس معاملے میں اس قدر غلو (۵) بھی پیدا ہوا ہے کہ مصر کے ایک عالم دین نے "جواہر القرآن" کے نام سے ایک ضخیم تفسیر لکھی اور قرآن کی ہر دوسری آیت سے کوئی نہ کوئی سائنسی نظریہ اخذ کیا ہے۔ اس تفسیر میں شائع شدہ تصاویر کو ہی دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ تفسیر کم اور "بیالوجی" کی کتاب زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

۲) قرآن کی عملی تفسیر

ایک اور چیز جس کو عام طور پر مدرّسین نظر انداز کر دیتے ہیں، وہ قرآن کی علمی اور عملی تفسیر کا فرق ہے۔ نظم ومفردات کی دقیق (۶) اور فصاحت وبلاغت کی لطیف بحثیں تفسیر قرآن کا تو موضوع ہو

(۱) بیہودہ باتیں (۲) چسپاں کرنا (۳) ماتحت (۴) معیار (۵) حد سے گزر جانا (۶) باریک/ نازک

سکتی ہیں لیکن انہیں درسِ قرآن کا موضوع بنانا دعوت وتبلیغ کی حکمت کے منافی ہے۔ اس لیے کہ یہ ساری بحثیں سامعین کو محض وقتی لطف وتسکین ہی فراہم کر سکتی ہیں۔ جہاں تک انذار، تبشیر اور تذکیر کا معاملہ ہے، تو ایسی بحثوں سے بالعموم ان مقاصد کے حصول کی بجائے ان کے برعکس نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ درسِ قرآن کا اصل مقصد لوگوں کو قرآن پر عمل کرنے کے لیے ترغیب وتشویق دلانا ہو نہ کہ قرآن کے علمی، اعجازی اور بلاغی پہلوؤں کی وضاحت کرنا۔ حضرت عائشہؓ کا فرمان ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مکمل قرآن کی تفسیر بیان کی ہے اور آپ کی یہ تفسیر آپؐ کے عمل میں ہے یعنی فعلی سنت میں ہے، جس کو قرآن کی اصطلاح میں "تبیین" یا "اُسوۂ حسنہ" کہتے ہیں۔

راقم الحروف نے پہلی مرتبہ جب رمضان کے مہینے میں نماز تراویح کے ساتھ ترجمۂ قرآن کی کلاس کا آغاز کیا تو شروع شروع میں اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر ترجمۂ قرآن کے درمیان اکثر وبیشتر وقت نظم قرآن کی پیچیدہ بحثوں کو سلجھانے میں لگ جاتا تھا' جو ایک طرف تو عوام الناس کی سمجھ سے بالاتر تھیں اور دوسری طرف حقیقت یہ تھی کہ ان ابحاث (۱) کا کوئی تعلق سامعین کے عمل سے نہ تھا۔ دوسری بار جب راقم الحروف نے رمضان کے دوران ترجمہ قرآن کی کلاس میں نظم قرآن اور اشتقاقاتِ قرآن کی بحثوں کی بجائے سامعین کو ایسی احادیث، اقوالِ صحابہ اور تاریخی واقعات سنائے جن کا تعلق عملی پہلو سے تھا تو لوگوں نے بھی پہلے کی نسبت زیادہ اثر لیا۔ جب تیسری بار رمضان میں ترجمۂ قرآن کرایا تو آیت ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۝١٣ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝١٤﴾ (الزخرف:13 تا 14) کے ذیل میں سواری پر سوار ہونے کی دعا اور طریقہ بتلایا تو درس کے بعد ایک بزرگ نے اس بات کی طرف میری توجہ دلائی کہ "پچھلی دفعہ آپ نے اس آیت کی تشریح میں فلاں حدیث بیان کرتے ہوئے سواری پر سوار ہونے کا جو طریقہ بتایا تھا وہ اس سے قدرے مختلف ہے جو آپ نے آج بتایا ہے"۔ دیکھئے ان صاحب نے اس حدیث کو یاد رکھا حالانکہ خود مجھے وہ حدیث بھول چکی تھی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ حدیث عمل سے متعلق تھی لہٰذا اس کو سننے کے بعد وہ اپنے عمل میں بھی لے آئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ نظمِ قرآن اور فصاحت وبلاغت کی علمی ابحاث طالبانِ قرآن کے لیے

(۱) بحث کی جمع

تعلیم و تعلّم [۱] کے مراحل میں تو مفید ثابت ہو سکتی ہیں؛ جبکہ وعظ و نصیحت کے حلقوں میں اس قسم کے علمی نکات سے سامعین کی اصلاح تو نہیں ہوتی البتہ مدرّسین کا علمی رعب ضرور قائم ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی ترجمہ قرآن اور درسِ قرآن کی مختصر دورانیہ کی مجالس میں اس قسم کی پیچیدہ بحثوں میں الجھنا اس لیے بھی کوئی مستحسن امر نہیں ہے کہ کم ہی مدرسین ایسے ہوتے ہیں جو ایسی بحثوں کو چھیڑ کر ان کا حق ادا کر سکیں۔

۷) ابلاغ کے ساتھ اصلاح بھی

ہمارے ہاں دروسِ قرآن میں اصلاح سے زیادہ ابلاغ [۲] پر زور ہوتا ہے اور ہر درس کے آخر میں بغیر سوچے سمجھے ہم یہ آیت بھی تلاوت کر دیتے ہیں:

﴿وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ⑰﴾ (یٰس :17)

"اور نہیں ہے ہماری ذمہ داری مگر واضح طور پر پہنچا دینا"۔

لیکن ہم حضرت شعیب علیہ السلام کے اس قول کو بھول جاتے ہیں جو انہوں نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

﴿ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ﴾ (ھود:88)

"میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں جس قدر میں کر سکتا ہوں"۔

داعی اور مدعو [۳] کا اصل رشتہ صرف ابلاغ کا نہیں ہے، بلکہ "ابلاغ مع الاصلاح" کا ہے۔ مدرّسین کو چاہیے کہ اپنے دروس کو ابلاغ کے ساتھ ساتھ مخاطبین کی اصلاح کا بھی ذریعہ بنائیں۔ درسِ قرآن کے ذریعے ہم لوگوں کی اصلاح کیسے کر سکتے ہیں، اس کو ایک زندہ مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ سمیہ رمضان ایک مُدرِّسہ ہیں جو کہ اپنے ہفتہ وار درسِ قرآن میں ہر ہفتے ایک آیت کا انتخاب کرتی ہیں اور درسِ قرآن کے شرکاء کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس ہفتے دن رات اس آیت کے معانی پر غور کرتے ہوئے اس کا وِرد کریں۔ ایسے ہی ایک درس میں محترمہ سمیہ رمضان نے قرآن کی درج ذیل آیت ﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ⑲﴾ (لقمان:19) کا انتخاب کیا اور درس کے تمام شرکاء کو یہ ہدایت کی کہ وہ اس آیت کا اس ہفتے توجہ کے ساتھ مسلسل ورد جاری رکھیں۔ ایک خاتون جو کہ درس میں شریک ہوتی تھیں، گھر میں بہت زیادہ

(۱) سکھانا اور سیکھنا (۲) پہنچانا/تبلیغ (۳) جسے دعوت دی جائے

چیختی چلاتی تھیں۔ اس آیت کا وِرد ان کی اصلاح کا کس طرح ذریعہ بنا، یہ انہی کی زبانی ہم سنتے ہیں:

"جیسا کہ درس میں محترمہ سمیہ نے راہنمائی کی تھی، میں یہ آیت بار بار دہراتی رہی حتیٰ کہ مجھے حفظ ہو گئی۔ یوں ایک دن گزر گیا۔ اگلے دن کی صبح حسب معمول بچے اسکول جانے کے لیے تیاری کر رہے تھے۔ اس مرحلے پر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میری حالت انتہائی قابل رحم ہوتی ہے۔ ایک ہی وقت میں ہر کوئی اپنی اپنی چیز مانگ رہا ہوتا ہے۔ مجھے اس موقع پر چلّانے کی عادت تھی، میں بچوں کے ساتھ چیخ چیخ کر باتیں کرتی تھی، مگر اس صبح میں نے آیت کریمہ ﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ⑲﴾ (لقمان:19) پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس آیت کے نفاذ کے حقیقی ٹیسٹ کے وقت، بچوں کے رویے کی وجہ سے میرے رویے میں بھی شدت آنے لگی۔ میرے مزاج میں آج پھر تیزی آنے لگی، کیوں کہ ایک بچے کو جوتا نہیں مل رہا تھا، دوسرے کو بیلٹ، تیسرے کو پین اور چوتھے کو بستہ۔ یہ سن کر میری کیفیت وہی ہو گئی جو پہلے ہوتی تھی۔ میں نے بچوں کو زور زور سے ڈانٹنا شروع کر دیا۔ مگر اسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ میرا چہرہ سرخ ہو گیا ہے اور میری شکل گدھے کی سی ہو رہی ہے، کان گدھے کی طرح لمبے ہو رہے ہیں۔ میں نے فوراً سوچا کہ گدھے کی طرح آواز نکالنے سے تو ہمیں روکا گیا ہے۔ ہمیں اپنی آواز گدھے سے مشابہ نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے جب روک دیا ہے، اپنا حکم دے دیا ہے تو پھر ہمیں اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیے۔ کہیں ہماری شکل بگڑ نہ جائے، ہم یہودیوں کی طرح خنزیروں اور بندروں کی صورت میں مسخ نہ کر دیے جائیں! میں چیخنے چلانے کی اس تشبیہ کا تصور کر کے شرمندہ ہوئی، کیوں کہ اس طرح میں انسانوں سے نکل کر حیوانوں کے زمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ تصور آتے ہی میں بچوں کے لیے نرم پڑ گئی اور آہستہ آہستہ بولنے لگی۔ ''ہاں یہ لو، یہ تمہارا جوتا ہے، قلم بھی یہیں کہیں ہوگا، تم نے اپنی ضروری چیزیں کل ہی اپنے بستے میں کیوں نہ رکھ لیں''۔ یوں یہ مشکل ترین مرحلہ آسانی سے گزر گیا۔ ان چند منٹوں میں میرا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ جایا کرتا تھا اور مجھے اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، لیکن اس دن یہ لمحے سکون و قرار سے گزر گئے"۔ [11]

اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے ہم ہر ہفتے ایک آیت کا انتخاب کر کے اپنی اور سامعین کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ㉞﴾ (بنی اسرائیل:34) کے ورد سے عہد کی پابندی، سورۂ مریم کی آیت ﴿فَخَلَفَ مِنْ ۢ

بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ (مریم:59) کے ورد سے نماز کی پابندی اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ كَانَ مَشۡهُوۡدًا ﴿۷۸﴾ (بنی اسرائیل:78) کے ورد سے اپنے آپ کو اور اپنے درس کے شرکاء کو نماز فجر کی جماعت کے ساتھ ادائیگی پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح غیبت، بہتان، تمسخر اور سوءِ ظن جیسی معاشرتی برائیوں سے بھی سورۃ الحجرات کی آیات کو موضوعِ درس بنانے سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس سورۃ المؤمنون کی شروع کی آیات اور سورۃ الفرقان کی آخری آیات کو بھی اپنی اصلاح کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے اور سورۃ التوبہ اور سورۃ الصّف کی منتخب آیات کے مذاکرے اور ورد سے باطل نظام کے خلاف جذبات کو مہمیز[۱] دینے اور اللہ کی رضا کی خاطر تن من دھن لگانے کے دواعی[۲] پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کا بہتر اور مفید طریقہ یہی ہے کہ ایک ہفتے کے لیے صرف ایک ہی آیت یا حکم کا انتخاب کر کے اس کے کثرتِ ذکر سے اس آیت کو اس کے مفہوم سمیت حرزِ جان[۳] بنایا جائے۔

۸) درسِ قرآن کا معیار

درسِ قرآن کے حوالے سے جو کوتاہیاں پائی جاتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں درسِ قرآن کے لیے مدرّس کا کوئی معیار مقرر نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں ایک مدرّس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کم از کم عربی زبان کے بنیادی قواعد اور اسالیب سے واقف ہو اور اس کی تجوید اس قدر درست ہو کہ قرآن پڑھتے وقتِ لحن جلی[۴] کا مرتکب نہ ہو۔ ایک مدرّس اگر قرآن کی تلاوت بھی صحیح طرح نہ کر سکتا ہو تو اس کو درسِ قرآن کی اجازت دینا قرآن کے ساتھ ظلم ہے۔ ایسے مدرّسین جو کہ درسِ قرآن کے کم از کم معیار پر بھی پورے نہ اترتے ہوں' انہیں چاہیے کہ یا تو وہ درسِ قرآن کی بجائے انفرادی دعوت و تبلیغ کے میدان کا انتخاب کریں یا پھر کسی مستند عالمِ دین کے ترجمہ و تفسیر قرآن کی مجالس قائم کریں۔ فہمِ قرآن کی مختلف تحریکوں اور جماعتوں کے منتظمین کو بھی چاہیے کہ وہ علماء کی زیر نگرانی مدرّسین کے لیے مختلف قسم کی تربیتی ورکشاپوں کا بھی وقتاً فوقتاً انعقاد کرتے رہیں۔

---

(۱) تیز کرنا/ بڑھانا (۲) داعی کی جمع/ دعوت دینے والے (۳) بہت عزیز رکھنا

(۴) نمایاں اور واضح غلطی جس سے مفہوم بدل جاتا ہے۔

درس کی تیاری کیسے کریں؟

1- درس یا خطاب میں تذکیری اور عملی پہلو یعنی ایمان و یقین کی پختگی اور دینی فرائض کی ادائیگی پر توجہ زیادہ مرکوز رہے۔

2- ضروری علمی نکات کو ایسے بیان کریں کہ وہ تذکیر کے پردے میں لپٹے ہوں یا جو حکمت کے حصول کا ذریعہ بن جائیں۔

3- ہمیشہ ایسی بات کو بیان کے لئے منتخب کریں جس پر آپ کو مکمل انشراح ہو۔

4- عقائد اور اعمال کے اعتبار سے اسلاف سے چمٹے رہنا اور اپنی رائے پیش کرنے سے اجتناب کرنا انتہائی ضروری ہے۔

5- گفتگو میں وزن پیدا کرنے کے لئے عملی مثالیں ضرور تلاش کریں۔ (گلاس ٹوٹنے پر تو غصہ آتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے حکم کے ٹوٹنے پر نہیں آتا)

6- گفتگو کو حالاتِ حاضرہ سے Relate کرنے کی کوشش کریں۔ (ناشکری کی سزا لباس الجوع والخوف النحل:112)

7- فقہی مسائل سے امکانی حد تک اجتناب کریں اور اُنہیں اپنے بیان کا حصہ نہ بنائیں۔

8- ضعیف حدیث کو احتیاط سے بیان کریں اور موضوع روایات کے بیان سے مکمل اجتناب کریں۔

9- سامعین کی ذہنی استعداد، مسائل اور ان کی تربیت، اصلاح اور دعوت کے لحاظ سے ضروریات کا لحاظ رکھیں۔

10- درس قرآن اور خطاب میں بیان کی جانے والی آیات کے حوالہ سے متن کی درست تلاوت کی مشق کریں۔

درس/خطاب کے مواد کی فراہمی

1- دین کا ہمہ گیر تصور، فرائض دینی کے جامع تصور اور انقلابی فکر پیش کرنے کے لئے بانئ محترم اسرار احمدؒ کے خطابات اور تحریر کو گفتگو کی بنیاد بنائیں۔

2- دیگر تفاسیر بالخصوص علماء کرام میں سے کسی کی تفسیر کا مطالعہ ضرور کریں تا کہ اسلاف سے ربط رہے۔ مختلف مسالک کے علماء کی تفاسیر زیر مطالعہ رکھیں اور مخاطبین کے مسلک کے اعتبار سے حوالہ دیں مثلاً بریلوی مکتب کے لوگوں کے سامنے تفسیر ضیاء القرآن، دیو بندی مسلک کے لوگوں کے سامنے تفسیر عثمانی یا معارف القرآن اور اہل حدیث مسلک کے لوگوں کے سامنے تیسیر القرآن یا احسن البیان وغیرہ کا حوالہ فائدہ مند ہوگا۔ ذاتی رائے ہرگز بیان نہ کریں بلکہ کوشش کریں کسی مفسر کے حوالہ سے رائے بیان کریں حتیٰ کہ بانئ محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی بیان کردہ بات بھی اپنی طرف سے بیان نہ کریں بلکہ ان کا نام لے کر رائے بیان کریں۔ یاد رکھیئے بزرگوں کی طرف سے بیان کرنے سے بات کا وزن بڑھ جاتا ہے۔

3- موضوع سے متعلق دیگر کتب، مضامین، نوٹس کا مطالعہ کریں۔ اس حوالہ سے سینئر رفقاء سے مشورہ اور رہنمائی لیتے رہیں۔

4- انٹرنیٹ سے مدد حاصل کریں۔ دستیاب مضامین، کتب اور دیگر مواد سے استفادہ مفید رہے گا البتہ اس حوالہ سے بھی سینئر رفقاء سے مشورہ اور رہنمائی لیتے رہیں۔ نیز تنظیم اسلامی اور انجمن خدام القرآن کی ویب سائیٹ سے استفادہ بھی مفید رہے گا۔

5- بیان میں تاثیر پیدا کرنے اور اسے قابلِ عمل ثابت کرنے کے لئے صحابہ کرامؓ اور دیگر سلف صالحین کے مستند واقعات شامل کیجئے۔ (ابو دحداحؓ کا واقعہ)

6- بانئ محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی گفتگو کے مخاطب عموماً تعلیم یافتہ لوگ ہوتے تھے لہٰذا مشکل اصطلاحات والفاظ کے استعمال سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن آپ اپنے مخاطبین کی ذہنی سطح

کو سامنے رکھتے ہوئے بات کریں۔

7- لازمی نہیں کہ بانئ محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی بیان کردہ ہر بات آگے بیان کی جائے بلکہ صرف وہی مضامین آگے بیان کریں جن کو آپ سمجھ چکے ہوں اور آگے سمجھانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں اور مخاطبین بھی اس ذہنی سطح کے ہوں جو اس بات کو سمجھ سکتے ہوں۔

8- بانئ محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ سے استفادہ ضرور کریں لیکن ہو بہو کاپی کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ کوشش کریں کہ ان کے خیالات کو اپنے اور آسان الفاظ میں پیش کریں اسی طرح مثالیں اور واقعات اور اندازِ بیان میں بھی جدّت لانے کی کوشش کریں۔

9- بعض اوقات بانئ محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ سخت الفاظ بھی استعمال فرمایا کرتے تھے جیسے "دفع ہو جاؤ" وغیرہ، لیکن ان کے مرتبے کی وجہ سے سامعین برا نہ مانتے تھے لیکن آپ کو اس انداز سے مکمل اجتناب کرنا لازم ہوگا۔

10- احادیثِ مبارکہ کے مطالعے کو وسعت دیں مثلاً تنظیم کے شائع کردہ مجموعے، معارف الحدیث، ریاض الصالحین، مشکوٰۃ شریف، زادِ راہ، راہِ عمل وغیرہ کو زیر مطالعہ رکھیں۔

درس/خطاب کی ترتیب

1- تمام نکات اور متعلقہ مواد کو ایک بار جمع کر لیں۔

2- جمع شدہ نکات اور مواد کی مدد سے مختلف عنوانات قائم کریں۔ (تمہید، موضوع کی اہمیت، لغوی و اصطلاحی مفہوم، قرآنِ حکیم سے رہنمائی، احادیثِ مبارکہ سے رہنمائی، حرفِ آخر)

3- درس قرآن دیتے ہوئے متنِ قرآن سے بندھے رہتے ہوئے تشریح کریں۔

4- مؤثر تمہید کے لئے بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے جس سے درس یا خطاب کا ایک خاکہ سامعین کے سامنے آ جاتا ہے نیز حرفِ آخر گفتگو کا نچوڑ ہوتا ہے اور اسی میں اہم ترین نکات پیش کرنا ہوتے

ہیں جو سامعین کے ذہن پر گہرے اثرات چھوڑ جائیں۔

5- عنوانات کو منطقی ترتیب دینے کی کوشش کریں۔

6- نکات کو ایک منطقی ترتیب کے ساتھ متعلقہ عنوان کے تحت بیان کا حصہ بنائیں۔ نکات کا نمبروار صورت میں بیان زیادہ مفید رہتا ہے۔

7- دستیاب وقت کا اندازہ کر کے تعین کر لیں کہ کن نکات کو تفصیل سے بیان کرنا ہے اور کن باتوں کو سرسری طور پر۔ یاد رہے کہ لمبی بات کرنا آسان ہوتا ہے اور مختصر بات کرنا مشکل۔

درس/خطاب کے دوران ملحوظ رکھنے والے نکات

1- قرآنِ حکیم کے ظاہری آداب کو ملحوظ رکھیں یعنی اسے احترام کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے اٹھائیں یا سینہ سے لگائیں اور دورانِ درس مناسب مقام پر سامنے رکھیں۔

2- مخاطبین کو سمیٹ کر بٹھائیں اور اِس بات کو یقینی بنائیں کہ ہر ایک تک آواز پہنچ رہی ہو۔

3- بیان کے لئے مناسب دورانیہ متعین کریں اور پھر اِس کی پابندی کا اہتمام کریں۔

4- وقت کی مناسبت سے مضمون کو مرتّب کریں۔ یہ پیشِ نظر رہے کہ اصل پیغام لوگوں تک پہنچ جائے۔

5- نکات کو ترتیب کے ساتھ مناسب وقفہ سے دہراتے رہیں۔

6- فتویٰ کا انداز اختیار نہ کریں۔ کسی معاملہ پر انتہائی بات نہ کریں مثلاً " ہرگز قبول نہ ہوگا" کے بجائے" اندیشہ ہے کہ شاید قبول نہ ہو"۔

7- گفتگو میں توازن رکھیں مثال کے طور پر

- کسی بھی معاملے میں عزیمت اور رخصت دونوں پہلو بیان کریں۔
- ضرورت کے تحت انتہائی احتیاط کے ساتھ لطیف مزاح ہو، تاکہ اکتاہٹ پیدا نہ ہو لیکن سنجیدگی متاثر نہ ہو، تاکہ گفتگو کی تاثیر برقرار رہے۔
- مبالغہ نہ ہو یعنی قرآن وحدیث کی بیان کردہ نوید یا وعید میں اپنی طرف سے اضافہ نہ کیا جائے۔

8- فقہی مسائل میں کسی ایک موقف کی طرف نہ جھکیں۔ اوّل تو بیان کرنے سے اجتناب کریں اور اگر ضرورت ہو اور بیان کرنے کی استعداد ہو تو دونوں معروف مکاتبِ فکر (حنفی و اہل حدیث) کی آراء بیان کر دیں۔

9- کسی شخص/گروہ/مسلک کا نام لے کر تنقید سے حتی الامکان اجتناب کریں۔ ضرورت ہو تو عمومی انداز میں ذکر کر دیں۔

10- کسی برائی کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ کے بجائے ہم کا اسلوب اختیار کریں یعنی ہمارا یہ حال ہے کہ ہم یوں کرتے ہیں۔

11- مضمون کی مناسبت سے آواز میں زیر و بم پیدا کریں۔ البتہ درس، تربیتی نشست، لیکچر اور عوامی خطاب میں فرق ملحوظ رکھیں۔

12- سوالیہ/ چونکا دینے والا انداز اختیار کریں۔ (مثلاً ہمارا شمار کس گروہ میں ہے؟)

13- فلسفیانہ اسلوب اختیار نہ کریں بلکہ عام فہم گفتگو کریں اور تکلف سے اجتناب کریں یعنی جملہ سے جملہ ملانا اور قافیہ سے قافیہ ملانا۔

14- اشعار کو صحیح ادائیگی سے پڑھیں ورنہ نہ پڑھیں۔

15- Eye Contact بھرپور ہو اور سب کی طرف دیکھیں۔

16- پورے وجود (Body Language) سے خطاب کریں۔

17- غیر ضروری جسمانی حرکات سے اجتناب کریں۔ (مثلاً بلاوجہ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے رہنا)

18- بعض ساتھیوں کا کوئی خاص تکیہ کلام ہوتا ہے مثلاً "جو ہے" یا "یعنی کہ" یا "مطلب" یا "ٹھیک ہے" وغیرہ۔ اِس تکیہ کلام کو کم سے کم کرنے کی کوشش کریں۔

19- اہم احتیاطوں کو ملحوظ رکھا جائے مثلاً انبیاء کرامؑ، صحابہ کرامؓ، اولیاء کرامؒ اور اہم دینی، سماجی اور سیاسی شخصیات کا ذکر احترام کے ساتھ کیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ پر درود کے مکمل الفاظ پڑھے جائیں۔ آپ ﷺ کا ذکر ادب کے ساتھ کیا جائے اور آپ ﷺ کے لیے واحد کا صیغہ استعمال کرنے کے بجائے جمع کا صیغہ استعمال کیا

جائے ۔ آیاتِ قرآنی کا ترجمہ کرتے ہوئے اور گفتگو کے دوران نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے "تُو" یا "تم" کے بجائے "آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم" اور "کہہ دو" کے بجائے "کہہ دیجیے" کے الفاظ استعمال کریں۔

20- قریب ترین مسجد کی اذان کے دوران گفتگو روک دی جائے۔

21- بعض الفاظ کی ادائیگی میں صحیح تلفظ کا اہتمام کیا جائے مثلاً اطاعت، اقامت، اجازت، منکر، عمرو، انس، احزاب، اخلاق، متفق علیہ، کہف، جہنم، نفل، ثقہ، مستحب، حتی الامکان، ادھیڑعمروغیرہ۔

22- اگرکوئی اصلاح کی طرف متوجہ کرے تو خندہ پیشانی سے قبول کریں۔

23- سوالات کے جوابات تحمل سے دیں، کوئی الجھانے کی کوشش کرے تو خوب صورتی سے اعراض کیجیے۔

24- مخاطبین کے ساتھ ایک ذاتی رابطہ اور تعلق قائم کیجیے تا کہ اُن کی مزید پیش قدمی میں رکاوٹوں کو دور کیا جا سکے۔

25- آخر میں پوری گفتگو کا خلاصہ یا حاصل ضرور بیان کریں۔

26- گفتگو کے دوران مناسب وقفوں سے عمل کی توفیق، جنت کے حصول اور جہنم سے بچنے کی دعائیں کرتے رہیں۔

☆ — ☆ — ☆

الجماعۃ بمعنی اہل سنت والجماعۃ

مولانا گوہر رحمانؒ، کی کتاب "تفہیم المسائل" سے ایک اقتباس

احادیث میں "الجماعۃ" کا اطلاق ان تمام مسلمانوں پر بھی ہوا ہے جو فکر و عمل کے اعتبار سے سنتِ رسولؐ اور سنتِ اصحاب رسولؐ کا التزام کرتے ہیں، جن کو اصطلاحاً اہل سنت والجماعۃ کہا جاتا ہے۔ "الجماعۃ" کا یہ مفہوم اس حدیث سے ماخوذ ہے جو حدیثِ افتراقِ اُمّت کے نام سے مشہور ہے۔

حدیثِ افتراقِ اُمّت اور اس کا مفہوم

عَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ : اَلَا اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَامَ فِيْنَا فَقَالَ : ((اَلَا اِنَّ مَنْ قَبْلَكُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ افْتَرَقُوْا عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً وَاِنَّ هٰذِهِ الْمِلَّةَ سَتَفْتَرِقُ عَلٰى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِيْنَ، ثِنْتَانِ وَسَبْعُوْنَ فِي النَّارِ وَ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ وَهِيَ الْجَمَاعَةُ)) وَفِيْ رِوَايَةٍ :((وَاِنَّهٗ سَيَخْرُجُ مِنْ اُمَّتِيْ اَقْوَامٌ تَجَارٰى بِهِمْ تِلْكَ الْاَهْوَاءُ كَمَا يَتَجَارَى الْكَلْبُ لِصَاحِبِهٖ — وَقَالَ عَمْرٌو الْكَلْبُ بِصَاحِبِهٖ لَا يَبْقٰى مِنْهُ عِرْقٌ وَلَا مَفْصِلٌ اِلَّا دَخَلَهٗ)) (12)★

"حضرت معاویہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمارے درمیان کھڑے ہو کر فرمایا: "لوگو سنو! جو اہل کتاب تم سے پہلے گزر چکے ہیں وہ 72 فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور یہ ملت (میری اُمّت) 73 فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی جن میں سے 72 دوزخ میں جائیں گے اور ایک جنت میں جائے گا، یہی جنت میں جانے والے "الجماعۃ" ہیں۔"

دوسری روایت میں اس کے بعد آپؐ کے یہ الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں کہ: "میری اُمّت میں ایسے گروہ بھی ظاہر ہوں گے جن کے اندر یہ خواہشاتِ نفس اس طرح پھیل جائیں گی جس طرح کہ پاگل کتے کے کاٹے ہوئے شخص کے جسم میں اس کے جراثیم پھیل جاتے ہیں کہ اس کی کوئی رگ اور بند ایسا نہیں ہوتا جس میں جراثیم داخل نہ ہوئے ہوں۔"

ترمذی کی روایت میں آیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا:

مَنْ هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ)) (13)

''یارسول اللہ! یہ کون سی جماعت ہوگی؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''یہ وہ جماعت ہوگی جو میری سنت اور میرے اصحاب کی سنت پر قائم ہو۔''

ایک دوسری حدیث میں اس ''الجماعۃ'' کو ''السواد الاعظم'' کا نام دیا گیا ہے۔ تفرقِ اُمّت کی یہ حدیث ترمذی، ابوداوٗد، ابن ماجہ، مسند احمد، صحیح ابن حبان اور مستدرک میں نقل ہوئی ہے۔ اس کے بعض طرق [۱] صحیح ہیں، بعض حسن ہیں اور بعض ضعیف بھی ہیں۔ حافظ شمس الدین سخاویؒ (متوفی ۹۰۲ھ) نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ 15 صحابہ سے اسانید کثیرہ [۲] کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔ (14)

اسی مضمون کی ایک حدیث نسائی، مسند احمد، دارمی اور دوسری کتابوں میں نقل ہوئی ہے جس میں اللہ کے راستے کے آس پاس شیطانی راستوں کا ذکر ہوا ہے، مگر اُن راستوں کی تعداد نہیں بتائی گئی۔

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خَطًّا ثُمَّ قَالَ: ((هٰذَا سَبِيْلُ اللّٰهِ)) ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ يَّمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَقَالَ: ((هٰذَا سُبُلٌ عَلٰى كُلِّ سَبِيْلٍ مِّنْهَا شَيْطَانٌ يَّدْعُوْ اِلَيْهِ)) وَقَرَأَ: {وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ} (الانعام:15) (15)

''ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سمجھانے کے لیے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا کہ: ''یہ اللہ کا راستہ ہے''۔ پھر اس کے دائیں بائیں لکیریں کھینچیں اور فرمایا کہ: ''یہ وہ راستے ہیں جن میں سے ہر راستے پر ایک شیطان بیٹھا ہوا ہے جو لوگوں کو اپنے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے''۔ اس تمثیل کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی کہ: ''یہ میرا راستہ ہے، اسی پر چلتے رہو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو، یہ تم کو اللہ کے راستے سے ہٹا دیں گے۔''

رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس تمثیل میں سبیل اللہ کو خطِ مستقیم سے تشبیہہ دی ہے اور قرآنِ کریم میں ان کے اس راستے کو صراط مستقیم، قصد السبیل اور اَلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (بنی اسرائیل:9) کہا گیا ہے۔ یعنی سیدھا و کشادہ اور افراط و تفریط [۳] کے درمیان اعتدال و توازن

(۱) مراد ہے روایات (۲) بہت سی اسناد (۳) کمی بیشی، غیر معتدل حالت

پر مبنی راستہ یہی قرآن وسنت کا راستہ ہے۔ اور شیطانی راستوں کو ان ترچھی اور ٹیڑھی لکیروں سے تشبیہہ دی ہے جو خطِ مستقیم کے دائیں بائیں کھینچی گئی ہیں۔ یہ ان بدعتی فرقوں کے راستے ہیں جنہوں نے اپنا رابطہ اسلام سے بالکل منقطع نہیں کیا بلکہ اسلام کی شاہراہ سے اپنے لیے رابطہ سڑکیں بنالی ہیں۔

افتراقِ اُمّت کی حدیث میں جن 72 فرقوں کا ذکر ہوا ہے وہ بھی اُمّت مسلمہ اور اہلِ قبلہ سے تعلق رکھتے ہیں مگر انہوں نے خواہشِ نفس اور قرآن وسنت کی نصوص میں تکلفی تاویلات [۱] کی بنا پر سنتِ رسولؐ اور سنتِ اصحابِ رسولؐ کے خلاف بدعات وضلالات [۲] کے راستے نکال لیے ہیں اور ان پر چل پڑے ہیں۔ ان میں سے خوارج اور روافض اور بعض دوسرے فرقے سیاسی مقاصد رکھتے تھے اور کچھ دوسرے عوامل کی وجہ سے بنے تھے۔ مقاصد اور عوامل جو بھی تھے ان کی تفصیل اس وقت پیش نظر نہیں ہے، مگر تھے یہ بدعتی فرقے جنہوں نے اسلام سے اپنا تعلق توڑے بغیر سوادِ اعظم سے اپنے راستے الگ کر دیے تھے۔ حدیث میں یہ نہیں آیا کہ اُمّت میں ہمیشہ کے لیے 72 فرقے رہیں گے اور ان میں کمی بیشی کبھی نہیں ہوگی۔ بعض شارحینِ حدیث نے تو کہا ہے کہ 72 سے یہ مخصوص عدد مراد نہیں ہے، بلکہ یہ کنایہ ہے کثرت سے اور مراد یہ ہے کہ میری اُمّت میں بہت سے فرقے اور چھوٹے بڑے گروہ پیدا ہو جائیں گے جو میری اور میرے اصحاب کی سنت کا التزام نہیں کریں گے، بلکہ ہوائے نفس [۳] پر مبنی فلسفیانہ خیالات رکھیں گے۔ جیسا کہ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ:

((فَاِنَّهٗ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ فَسَيَرٰى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ))

''لیکن تم میں سے جو زندہ رہا تو بہت سے اختلافات دیکھ لے گا۔ پس اُس وقت تم میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفاءِ راشدینؓ کی سنت کا التزام کرو۔''

لیکن اکثر شارحین نے 72 کا عدد مراد لیا ہے، مگر یہ کسی نے بھی نہیں کہا کہ اُمّت میں ہمیشہ کے لیے یہی فرقے رہیں گے، نہ کم ہوں گے اور نہ زیادہ ہوں گے۔ اس لیے کہ حدیث میں یہ بات موجود ہی نہیں ہے کہ ہمیشہ کے لیے یہی تعداد رہے گی۔ یہ 72 بدعتی فرقے کون ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے نہ ان کے نام بتائے ہیں نہ ان کے عقائد ونظریات کی تفصیلات بتانا ضروری سمجھا ہے، بلکہ صرف ایک جامع قسم کی

(۱) غیر ضروری وضاحتیں (۲) گمراہیاں (۳) نفسانی خواہشات

صفت اور علامت بتادی ہے جس سے وہ پہچان لیے جائیں گے اور وہ صفت و علامت یہ ہے کہ وہ سنتِ رسول ؐ، سنت خلفاء راشدین اور سنتِ اصحابِ رسول ؐ کا التزام (۱) نہیں کریں گے بلکہ ہوائے نفس کا اتباع کریں گے۔ چنانچہ جب یہ فرقے نمودار ہوئے تو مسلمانوں نے پہچان لیے اور محدثین نے ان کے نام اور عقائد معلوم کر کے بتادیے تاکہ اُمّت ان سے اجتناب (۲) کرے۔

اہل بدعت کے 72 فرقے

چوتھی صدی ہجری کے ایک عالم ہیں جو ابن بطۃ عکبری کے نام سے مشہور ہیں۔ "بطۃ" ان کے اجداد میں سے کسی کا لقب تھا اور عکبر بغداد سے 5 فرسخ (۳) کے فاصلے پر دریائے دجلہ کے ساحل پر ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ انہوں نے یوسف بن اسباطؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ کا قول نقل کیا ہے کہ:

أَصْلُ الْبِدَعِ أَرْبَعَةٌ الرَّوَافِضُ، وَالْخَوَارِجُ، وَالْقَدَرِيَّةُ وَالْمُرْجِئَةُ[16]

"تمام بدعتی فرقوں کے اصل فرقے چار ہیں: روافض (شیعہ) خوارج، قدریہ (معتزلہ) اور مرجئہ۔ باقی جتنے چھوٹے بڑے فرقے اور گروہ بنے ہیں وہ انہی چار کی ذیلی شاخیں اور گروپ ہیں جو الگ الگ ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں۔"

لیکن علم الکلام کی معروف کتاب المواقف میں لکھا ہے کہ:

وَكِبَارُ الْفِرَقِ الْإِسْلَامِيَّةِ ثَمَانِيَةٌ : اَلْمُعْتَزِلَةُ وَالشِّيْعَةُ وَالْخَوَارِجُ وَالْمُرْجِئَةُ وَالنَّجَارِيَّةُ وَالْمُشَبِّهَةُ وَالنَّاجِيَةُ

"بڑے اسلامی فرقے آٹھ ہیں: معتزلہ، شیعہ، خوارج، مرجئہ، نجاریہ، مشبہہ اور ناجیہ (یعنی نجات پانے والی جماعت "اہل سنت والجماعۃ")۔"

اس کے بعد اُن 8 فرقوں کی ذیلی شاخوں اور گروپوں کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

معتزلہ: 20	شیعہ: 22	خوارج: 20	مرجئہ: 5	
نجاریہ: 3	جبریہ: 1	مشبہہ: 1	ناجیہ: 1	کُل 73

ان ۷۲ فرقوں سے منسلک لوگ مجموعی طور پر بھی ہر دَور میں "الجماعۃ" اور "السواد الاعظم" سے منسلک مسلمانوں کے مقابلے میں 5 فیصد سے بھی کم رہے ہیں اور آج تو سوائے شیعہ کے مذکورہ ناموں

(۱) لازم کرنا (۲) پرہیز (۳) 27=1800x5 کلومیٹر

سے موسوم غالباً ایک فرقہ بھی دنیا میں موجود نہیں ہے۔ مشہور اسلامی فرقے تو آج صرف دو ہیں: ایک اہل سنت والجماعۃ اور دوسرا شیعہ۔ مگر یہ بات کبھی بھی بھولنی نہیں چاہیے کہ اہل سنت میں تمام وہ مکاتبِ فقہ شامل ہیں جو سنتِ رسول ؐ اور سنتِ اصحاب رسول ؐ کا عقیدہ اور عمل دونوں میں التزام ضروری سمجھتے ہیں۔ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ، اہل حدیث اور اہل ظاہر سب اہل سنت والجماعۃ میں شامل ہیں۔ اسی طرح پاکستان اور عالم اسلام کی وہ تمام اسلامی تحریکیں اور دینی تنظیمیں جو مذکورہ اصول کا التزام کرتی ہیں، جس نام سے بھی موسوم ہوں سب کی سب اہل سنت والجماعۃ میں شامل ہیں۔ اور سب ایک بہت بڑی عالمی نظریاتی جماعت یعنی الجماعۃ کے اعضاء ہیں اور اس کی ذیلی برادر تنظیمیں ہیں۔ فروع وجزئیات میں تعبیر واجتہاد کے تنوع کی وجہ سے جو اختلافِ آراء اہلِ سنت کے مکاتبِ فقہ کے درمیان موجود ہے یا طریقہ کار، حکمتِ عملی اور تدابیر کا جو تنوع اہل سنت کی ذیلی برادر تنظیموں اور تحریکوں میں نظر آرہا ہے یہ اہلِ سنت کے ملت واحدہ اور الجماعۃ ہونے کے منافی نہیں ہے۔

اہل بدعت 72 فرقوں کے افکار اور خیالات کی تفصیل شرح مواقف، الاعتصام للشاطبیؒ اور الملل والنحل کی کتابوں میں شرح وبسط (۱) کے ساتھ بیان ہوئی ہے، لیکن یہ تفصیل اس وقت موضوع سے کچھ زیادہ تعلق بھی نہیں رکھتی اور اس کی اب وہ افادیت بھی نہیں رہی جو ان فرقوں کے ظہور کے وقت تھی۔ آج کل نفاذِ شریعت کے مخالفین اور سیکولرازم کے مؤیدین (۲) کہتے پھرتے ہیں کہ کس فرقے کی شریعت نافذ کریں، اسلام میں تو 73 فرقے ہیں یہ بات کہنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو اسلامی نظام اور نفاذِ شریعت کے قائل ہی نہیں ہیں۔ اور دوسرے وہ ہیں جو 73 فرقوں کی حقیقت کو سمجھ نہیں سکے ہیں۔ اس لیے کہ اسلام کا تحقیقی علم تو دینی مدارس میں حاصل کیا جا سکتا ہے اور انہوں نے فرنگی طرز کی ملکی یا غیر ملکی یونیورسٹیوں میں علم حاصل کیا ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں کو جواب دینے کے لیے اور دوسری قسم کے مسلمانوں کو سمجھانے کے لیے عرض ہے کہ یہ برائے نام 72 فرقے، بلکہ اگر اِن کے مزید ذیلی گروپوں کو شمار کیا جائے تو اس سے بھی زیادہ فرقے، مجموعی طور پر اہلِ سنت کے مقابلے میں 5 فیصد سے بھی کم رہے ہیں اور آج ان کا دنیا میں نام بھی باقی نہیں رہا۔ اصل ملتِ واحدہ وہی ہے جس کو ناجیہ کہا گیا ہے اور وہ ہے "الجماعۃ"، بمعنی اہل سنت والجماعۃ۔ اس وقت تو عملاً دو ہی اسلامی فرقے ہیں: شیعہ اور سنی اور دونوں کے ممتاز اور نمائندہ 31 علماء

(۱) وضاحت (۲) حمایتی/تائید کرنے والے

نے جنوری 1951ء میں اسلامی ریاست کے لیے 22 دستوری نکات پر مکمل اتفاق کر لیا تھا۔ اور 23 اپریل 1995ء کو ملی یک جہتی کونسل کے اجلاس منعقدہ لاہور میں دونوں کے 70 ممتاز اور نمائندہ علماء نے ان 22 نکات پر دوبارہ دستخط کر دیئے ہیں اور کونسل کے منظور کردہ 17 نکاتی ضابطۂ اخلاق میں پہلا نکتہ ان 22 نکات کی توثیق ہے۔ ''خوئے بدرا بہانہ بسیار''[۱] کے طور پر سیکولرازم کے پجاریوں کا یہ 73 فرقوں والا بہانہ بھی اب ختم ہو گیا ہے۔ عملاً تو سوائے شیعہ کے اہل بدعت کے فرقے موجود ہی نہیں ہیں، لیکن افتراقِ اُمّت کی صحیح حدیث کو سمجھنے کے لیے ایک سوال کا جواب دینا ضروری ہے۔

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے الجماعۃ کے علاوہ باقی 72 فرقوں کو دوزخی کہا ہے۔ دوسری طرف ان کو اپنی اُمّت اور ملت بھی کہا ہے کہ میری اُمّت 73 فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ تو دوزخی فرقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی اُمّت کیسے ہو سکتے ہیں؟

جواب: دوزخ کی آگ کی نسبت صرف کفرِ بواح[۲] کی طرف نہیں کی جاتی بلکہ قرآن وسنت کی متعدد نصوص میں دوزخ، لعنت اور قہر وغضب کی نسبت ان مسلمانوں کی طرف بھی کی گئی ہے جو سنتِ رسول اور سنتِ اصحابِ رسول کا التزام نہیں کرتے، اگرچہ اسلام کے قطعی عقائد کو مانتے ہیں، کبائر کا ارتکاب کرتے ہیں۔ البتہ ان بدعتی لوگوں میں سے ایسے بھی تھے جو کفرِ بواح کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ تو ملتِ اسلامیہ سے خارج اور خلود فی النار یعنی دوزخ میں ہمیشہ رہنے کے مستحق ہیں، لیکن ان فِرقِ ضالہ[۳] میں سے جو کفرِ بواح کا عقیدہ تو نہیں رکھتے تھے مگر اپنی تاویل فاسد کی بنا پر اعتقاد فاسد رکھتے تھے وہ مسلمان ہونے کے باوجود دخول فی النار یعنی دوزخ میں کچھ وقت کے لیے داخل ہونے کے مستحق تھے اس لیے حدیث میں ان کو دخول فی النار کہا گیا ہے۔ باقی رہے اہلِ سنت کے وہ لوگ جو کبائر کے ارتکاب اور فرائض کے ترک میں مبتلا ہوں وہ اپنے برے اعمال کی وجہ سے دخول فی النار کے مستحق ہوتے ہیں، اعتقادِ فاسد کی وجہ سے اس کے مستحق اس لیے نہیں ہوتے کہ عقیدتاً تو وہ الجماعۃ میں شامل ہوتے ہیں جو جماعت ناجیہ ہے۔ **کلھم فی النار** کی یہی تحقیق شیخ عبدالحق محدثِ دہلوی نے کی ہے اور اس کو محققین کا قول کہا ہے۔(17)

اہل سنت والجماعۃ کا صحیح مفہوم

جماعت ناجیہ کو بعض احادیث میں ''الجماعۃ'' کہا گیا ہے، بعض میں ''السواد الاعظم'' کہا گیا ہے اور

(۱) بدنیت آدمی کام نہ کرنے کے بہت سے بہانے بنا لیتا ہے (۲) کھلا کفر (۳) گمراہ فرقے

بعض میں ''مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ'' کہا گیا ہے۔ ان تینوں کا مفہوم ایک ہے۔ اس لیے کہ ''الجماعۃ'' میں الف لام عہد کے لیے ہے اور مراد ہے وہ جماعت جو سنتِ رسول اور سنتِ اصحابِ رسولؐ پر قائم ہو۔ یہ جماعت بدعتی فرقوں کے مقابلے میں ہر دَور میں اکثریت ہی میں نہیں بلکہ غالب ترین اکثریت میں رہی ہے۔ اس لیے اس کو ''السواد الاعظم'' کا نام بھی دیا گیا ہے، یعنی بڑی جماعت لیکن الاعظم کے معنی اعظم شاناً و دفعتاً بھی آتے ہیں، یعنی بڑی شان اور رفعت و درجے والی جماعت، اگرچہ اس کی تعداد سب سے کم ہو۔ احادیث میں آیا ہے کہ قیامت کے قریب ایک دور ایسا بھی آئے گا کہ حق پر قائم رہنے والے مسلمان بہت کم ہوں گے اور معاشرے میں وہ غریب اور اجنبی ہوں گے۔ الجماعۃ کا یہ مفہوم (یعنی اہل سنت والجماعۃ) اس حدیث سے بھی ماخوذ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا ہے:

((وَلَنْ تَزَالَ هٰذِهِ الْاُمَّةُ — وفی روایۃ : لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ وفی روایۃ : لَا تَزَالُ مِنْ اُمَّتِيْ اُمَّةً قَائِمَةً عَلٰى اَمْرِ اللهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ — وفی روایۃ : مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُ اللهِ))(18)

''میری اُمّت میں سے ایک جماعت اللہ کے دین پر قائم رہے گی اور مخالفت کرنے والے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے (دین سے نہیں ہٹا سکیں گے) یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ جائے گا۔''

اس مضمون کی متعدد احادیث حضرت معاویہؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، ثوبانؓ، جابرؓ بن سمرہ، جابرؓ بن عبداللہ، عقبہؓ بن عامر اور عبداللہؓ بن عامر سے بخاری ومسلم میں نقل ہوئی ہیں کہ یہ کون سی جماعت ہے جس کا تسلسل برقرار رہے گا اور وقت مقررہ تک دنیا سے ان کا وجود مٹایا نہیں جا سکے گا؟

امام بخاری نے تو کتاب الاعتصام کے ایک ترجمۃ الباب میں اپنی رائے یہ دی ہے: هُمْ اَهْلُ الْعِلْمِ ''یہ اہلِ علم ہیں''۔ ابنِ حجرؒ اور امام نوویؒ نے امام احمد بن حنبلؒ کا قول نقل کیا ہے کہ:

اِنْ لَّمْ يَكُوْنُوْا أَهْلُ الْحَدِيْثِ فَلَا اَدْرِيْ مَنْ هُمْ ؟ وَقَالَ عِيَاضٌ اَرَادَ اَحْمَدُ بْنِ حَنْبَلَ اَهْلُ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ

''اگر یہ اہلِ حدیث نہیں ہیں تو میں نہیں جانتا کہ اور کون ہو سکتے ہیں؟ قاضی عیاض نے فرمایا کہ امام احمد کی مراد اہل سنت والجماعت ہیں''۔

امام بخاریؒ اور امام احمدؒ کے اقوال میں صرف تعبیر کا فرق ہے۔ اس لیے کہ اہلِ حدیث یعنی اہلِ

سنت کی دینی اور فکری قیادت ظاہر ہے کہ اہل علم ہی کے ہاتھ میں ہے۔ان کی علمی قیادت کے بغیر تو وہ دین پر قائم نہیں رہ سکتے۔امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ:

''ضروری نہیں ہے کہ اس جماعت کے افراد ایک ہی مقام پر کام کرتے ہوں، بلکہ یہ زمین کے اقطار واطراف (۱) میں پھیلے ہوئے بھی ہو سکتے ہیں۔کچھ ان میں سے بہادر اور دلیر مجاہد ہوں گے، کچھ فقہاء اور محدثین ہوں گے، کچھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرتے ہوں گے اور کچھ خیر اور بھلائی کے دوسرے کام کرتے ہوں گے۔یہ ایک معجزہ ہے کہ یہ صورت حال دَورِ نبویؐ سے لے کر آج تک قائم رہی ہے اور اُس وقت تک قائم رہے گی جب تک اللہ کا وہ حکم نہ آ جائے جس کا ذکر حدیث میں ہوا ہے۔''[19]

اللہ کے جس حکم کا حوالہ اس حدیث میں دیا گیا ہے اس کا ذکر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ:

''پھر اللہ تعالیٰ ایسی ہوا بھیج دے گا جو مشک کی طرح خوشبودار اور ریشم کی طرح نرم ہوگی، اور جب ایسے شخص پر گزرے گی جس کے دل میں ایک دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا تو اس کی روح قبض کرے گی۔اس کے بعد زمین پر بدترین لوگ ہی رہ جائیں گے اور اُن پر قیامت قائم ہو جائے گی۔''

اس سلسلے میں ایک دوسری مشہور حدیث بھی قابل غور ہے جو ایک طویل حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے پہلے ان پانچ احکام کا ذکر فرمایا ہے جن پر عمل کرنے اور بنی اسرائیل کو ان پر عمل کرنے کی ترغیب دلانے کا حکم اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو دیا تھا اور انہوں نے بیت المقدس میں ایک اجتماع بلا کر وہ احکام بیان فرمائے تھے۔وہ پانچ احکام تھے: عقیدۂ توحید، نماز، روزہ، صدقہ اور اللہ کا ذکر۔اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

((وَاَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ اَللّٰهُ اَمَرَنِيْ بِهِنَّ اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ وَالْجِهَادُ وَالْهِجْرَةُ وَالْجَمَاعَةُ فَاِنَّهٗ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ اِلَّا اَنْ يَّرْجِعَ وَمَنِ ادَّعٰى دَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ فَاِنَّهٗ مِنْ جُثَا جَهَنَّمَ))

(۱) ہر طرف

فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَاِنْ صَلّٰى وَصَامَ قَالَ : ((وَاِنْ صَلّٰى وَصَامَ فَادْعُوْا بِدَعْوَى اللّٰهِ الَّذِيْ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ عِبَادَ اللّٰهِ))[20]

''اور میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے: سننا، ماننا، جہاد کرنا، ہجرت کرنا، اور الجماعۃ کا التزام کرنا، اس لیے کہ جو شخص الجماعۃ سے بالشت برابر بھی الگ ہوا تو اس نے اسلام کا قلادہ (۱) اپنی گردن سے اتار دیا الا یہ کہ دوبارہ لوٹ آئے۔ اور جو لوگ جاہلیت کی دعوت دیتے ہیں (نسلی عصبیت کی) تو وہ جہنمی جماعتیں ہیں''۔ ایک شخص نے پوچھا کہ اگرچہ وہ نماز پڑھتے ہوں اور روزہ رکھتے ہوں؟ فرمایا: ''اگرچہ نماز پڑھتے ہوں اور روزہ رکھتے ہوں۔ پس اللہ کے بندو! تم لوگوں کو اللہ کی جانب بلاؤ جس نے تم کو مسلمین اور مؤمنین کا نام دیا ہے۔''

ترمذی کے مشہور شارح قاضی ابن العربی فرماتے ہیں کہ سمع سے مراد کانوں سے سننا نہیں ہے بلکہ دل سے قبول کرنا مراد ہے، ورنہ کانوں سے سننا اور دل سے قبول نہ کرنا تو منافقین کی عادت ہے: ﴿الَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ﴾ (الانفال:21) ''جو کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا ہے، حالانکہ وہ دل سے قبول نہیں کرتے''۔ ''الطاعۃ'' سے مراد ہے عمل کرنا جو دل سے قبول کرنے کی نشانی ہے۔ جہاد اور ہجرت کے معنی معروف ومعلوم ہیں اور التزامِ جماعت کے معنی ہیں:

لُزُوْمُ الطَّرِيْقَةِ الَّتِيْ يَتَمَسَّكُ بِهَا النَّاسُ وَلَا يَكُوْنُ الْمَرْءُ شَاذًّا خَارِجًا عَنْ مِّنْهَاجِهِمْ وَ هٰذِهِ الْجَمَاعَةُ هِيَ الصَّحَابَةُ وَالتَّابِعُوْنَ وَالْاَخْيَارُ الْمُسْلِمُوْنَ فِيْ جَادَةِ الدِّيْنِ وَمِنْهَاجِ الْحَقِّ الْمُبِيْنِ[21]

''اس طریقہ کا التزام کرنا جس پر دوسرے لوگ عمل کرتے ہیں اور یہ کہ انسان ان کے راستے سے الگ نہ رہے۔ یہ الجماعۃ (جس کے التزام کا حکم دیا گیا ہے) صحابہ وتابعین اور بہترین مسلمانوں کی جماعت ہے جو دین اور حق کی شاہراہ پر قائم رہتے ہیں۔''

علامہ طیّبی (متوفی 743ھ) لکھتے ہیں:

قَوْلُهٗ بِالْجَمَاعَةِ الْمُرَادُ بِهِمِ الصَّحَابَةُ اَيْ اٰمُرُكُمْ بِالتَّمَسُّكِ بِهَدْيِهِمْ

(۱) گلے کا پٹا

وَالْاِنْخِرَاطُ فِیْ زُمْرَتِهِمْ... قَوْلُهٗ قِیْدَ شِبْرٍ... وَالْمَعْنٰی أَنَّ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ بِتَرْكِ السُّنَّةِ وَارْتِكَابِ الْبِدْعَةِ وَلَوْ بِشَیْءٍ یَّسِیْرٍ نَقَضَ عَهْدَ الْاِسْلَامِ وَنَزَعَ الْیَدَ عَنِ الطَّاعَةِ (22)

''الجماعۃ سے مراد صحابہؓ ہیں، یعنی میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ جماعتِ صحابہؓ کے طریقے پر قائم رہو اور اپنے آپ کو ان کی جماعت سے منسلک رکھو۔ بالشت برابر الگ رہنے— سے مراد یہ ہے کہ جو بھی سنت کے ترک کرنے اور بدعت کے ارتکاب کی وجہ سے الجماعۃ سے جدا ہو، اگرچہ بہت تھوڑا سا الگ ہوا ہو تو اس نے اسلام کا عہد توڑ لیا اور اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا''۔

ملا علی قاری (متوفی 1024ھ) نے مرقاۃ شرح مشکٰوۃ میں اور مولانا عبدالرحمن مبارکپوری (متوفی 1353ھ) نے تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی میں بھی اسی طرح کی تشریح کی ہے۔ مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اسلامی حکومت پر مجتمع و متحد ہونے والے مسلمانوں کو بھی الجماعۃ کہا جاتا ہے اور التزامِ جماعت کی ہیئت کاملہ اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا ہے۔ لیکن احادیث میں الجماعۃ کا اطلاق ان تمام مسلمانوں پر بھی ہوا ہے جو سنتِ رسولؐ اور سنتِ صحابہؓ کا التزام کرتے ہوں جن کو اہل سنت والجماعۃ کہا جاتا ہے، اگرچہ ان کے پاس حکومت اور اقتدار موجود نہ ہو۔ اور التزامِ جماعت کا مفہوم یہ بھی ہے کہ اہل سنت والجماعۃ کے اُصولوں کی پابندی کی جائے اور ان سے خروج و شذوذ (۱) نہ کیا جائے۔ لیکن یہاں پر دو سوال پیدا ہوسکتے ہیں جن کا حل کرنا ضروری ہے۔

سوال ا: جب ان کی اپنی اسلامی حکومت نہیں ہوگی تو پھر کس چیز پر مجتمع ہوں گے؟

جواب: وہ ''مَا اَنَا عَلَیْهِ وَ اَصْحَابِیْ'' پر مجتمع ہوں گے، یعنی ان اُصول وعقائد پر ان کا اجتماع واتحاد ہوگا جو سنت رسولؐ اور اجماعِ صحابہؓ سے ثابت ہیں۔ اصول و افکار پر مجتمع ہونے والے افراد پر بھی ملت، اُمّت اور الجماعۃ کا اطلاق ہوتا ہے۔

سوال ۲: جماعت کے لیے تو امیر کی ضرورت ہوتی ہے، تو امیر کے بغیر صرف مشترکہ اصولوں پر اشتراک واجتماع کی بنیاد پر اہل سنت پر الجماعۃ کا اطلاق کیسے ہوسکتا ہے؟

جواب: اصولی اور نظریاتی جماعتوں کی اصل قیادت وہ افکار کرتے ہیں جن پر ان جماعتوں کی تشکیل

---

(۱) علیحدگی

ہوئی ہو۔ اُمّت مسلمہ کی اصل قیادت وہدایت بھی قرآن وسنت کرتے ہیں اور عملاً حق شناس، حق پرست علماء دین ''الجماعۃ'' کے فکری راہنما اور غیر حکومتی امراء وحکام ہوتے ہیں۔ اولوالامر کا لفظ اپنے عموم کے لحاظ سے دونوں طبقوں کو شامل ہے، یعنی علماء وفقہاء کو بھی اور امراء حکام کو بھی، اس لیے کہ نظامِ امر انہی دو طبقوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ (23)

حواشی

1) صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی، باب بدء الوحی۔
2) الاتقان فی علوم القرآن، امام سیوطی، جلد ۲، ص ۱۷۶۔
3) مقدمۃ اصول تفسیر از علامہ ابن تیمیہ، ترجمۃ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، ص ۸۔
4) تفسیر طبری، امام ابن جریر طبری، جلد ۱، ص ۷۸، دار المعارف مصر۔
5'6'7) تفسیر طبری، امام ابن جریر طبری، جلد ۱، ص ۸۶، دار المعارف مصر۔
8' 9' 10) مقدمہ اصول تفسیر از علامہ ابن تیمیہ، ترجمہ مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی، ص ۶۹۔
11) قرآن پر عمل، سمیہ رمضان، ص ۴۰'۴۱۔ منشورات، منصورہ لاہور۔
(12) سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب شرح السنۃ۔
(13) سنن الترمذی، کتاب الایمان عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، باب ما جاء فی افتراق هٰذه الامۃ۔
(14) المقاصد الحسنہ، ص ۱۵۸، بیروت، ۱۹۸۶ء۔
(15) مشکٰوۃ، باب الاعتصام، فصل ثالث۔
(16) الابانۃ عن شریعۃ الفرق الناجیۃ، طبع بیروت ۱۹۸۸ء، ج ۱' ص ۳۷۷۔
(17) لمعات التنقیح شرح مشکٰوۃ المصابیح، ج ۱، ص ۲۳۵۔
(18) صحیح البخاری، کتاب العلم و کتاب الاعتصام و کتاب المناقب۔
(19) شرح مسلم، کتاب الامارۃ۔
(20) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ۔
(21) سنن الترمذی، ابواب الامثال۔ ومسند احمد، طبع دار صادر، ج ۴' ص ۲۰۲'۳۰۔ والصحیح لابن خزیمہ' ج ۳' ص ۱۹۵۔ وموارد الظمآن بزوائد ابن حبان، ص ۲۹۹۔ والسنن الکبریٰ للبیهقی، ج ۸، ص ۱۵۷۔ وشرح السنۃ للبغوی، ج ۱۰' ص ۵۱'۔ ومشکٰوۃ المصابیح، کتاب الامارۃ، فصل ثانی۔
(22) عارضۃ الاحوذی، شرح ترمذی، ابواب الامثال۔
(23) الکاشف عن حقائق السنن، شرح مشکٰوۃ، ج ۷، ص ۲۰۰'۲۰۱۔

☆ —— ☆ —— ☆